ڈاکٹر فیاض عالم
Urdu Scholar, Shaheen Bagh, New Delhi

پریم چند کا افسانہ 'کفن': انسانیت کی شکست وریخت کی روداد

کفن نہ صرف پریم چند بلکہ اردو ادب کا شاہکار افسانہ ہے جسے پریم چند نے دہلی قیام کے دوران ڈاکٹر ذاکر حسین کی فرمائش پر لکھا جو پہلی بار رسالہ جامعہ میں 1935 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس افسانے میں غریبی، بے روزگاری، فاقہ کشی، مہاجنی مظالم زمینداروں کے ظلم وستم اور انسانی رشتوں کی شکست وریخت جیسے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بدھیا اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جو پورے افسانے میں چیخنے اور کراہنے کے علاوہ کوئی دوسری آواز نہیں نکالتی لیکن باوجود اس کے وہ پورے افسانے پر اپنا اثر رکھتی ہے۔ بدھیا کا یہ کردار افسانے کا ایسا کردار ہے جو اپنی انفرادیت کے ساتھ گھیسو اور مادھو دونوں کے رویوں کو بیان کرتا ہے۔ پریم چند کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے بدھیا کے دردزہ اور پھر اس کی وجہ سے اس کی اور اس کے ہونے والے بچے کی موت سے پوری کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ بدھیا ایک سال قبل مادھو کی زندگی میں آتی ہے۔ اس کے آنے کے بعد اس گھر میں تمدن آتا ہے وہ گھاس چھیلتی ہے اور اس کو بازار میں بیچ کر اپنے سسر گھیسو اور شوہر مادھو کا پیٹ بھرتی ہے۔

ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں؛

> ''زندگی کی عام منطق اور اخلاقیات کے مروج اصول وضوابط کے برخلاف ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ وہ عورت جو دوسرے افرادِ خانہ کی زندگی کے لیے معاون اور ان کی تن پروری کے لیے آلہ کار اور معاشی مسائل کو آسان بنانے کا ذریعہ بن کر نمودار ہوئی ہے اسی عورت کے ساتھ جب ان افراد کے برتاؤ اور انسانی اور اخلاقی رشتوں کی شکست کے مظاہر سامنے آتے ہیں تو اخلاقیات کے سارے اصول ہمیں پاش پاش ہوتے

نظر آتے ہیں۔ یہاں رشتوں کی شکست وریخت اور مروت و ہمدردی کے فقدان کا واحد سبب اپنے وجود کی بقا اور تحفظ کی وہ لرزہ خیز خود غرضی ہے جو ان دونوں کو غیر ذات کی کسی بھی اذیت اور بحران سے چشم پوشی پر مجبور کرتی ہے۔ گھیسو اور مادھو کا غیر انسانی برتاؤ ایک لمحے کے لیے ہمیں جھنجھوڑتا اور چونکاتا ہے مگر حیرت کی کیفیت دوسرے ہی لمحے اس جملے پر آ کر اپنی شدت کم کر دیتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ ''مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔'' یہاں بنیادی مسئلہ وہ آلو ہیں جنھیں بھون بھون کر دونوں اپنی بھوک مٹا رہے ہیں۔''(۱)

بدھیا جب بیمار ہوتی ہے تو گھیسو اور مادھو کو اس کی زندگی سے زیادہ چوری کیے ہوئے آلو کے ذریعہ اپنا پیٹ بھرنا زیادہ عزیز ہوتا ہے بھیشم ساہنی نے لکھا ہے کہ غریب کی دنیا میں سب کچھ ثانوی ہے، دردزہ سے چلانے اور آخر میں دم توڑ جانے والی بیوی ثانوی ہے۔ باپ بیٹا اور شوہر بیوی کا رشتہ بھی ثانوی ہے۔ بھنے ہوئے دو آلو بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہاں یہ دونوں تمام اخلاقیات کو بالائے طاق پر رکھ کر بدھیا کو پریشانی کے عالم میں مرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں کتنے افسوس کی بات ہے کہ شوہر بیوی کا رشتہ جسے سب سے پاک اور اٹوٹ مانا جاتا ہے وہ بھی بھنے ہوئے آلو کے آگے بے معنی ثابت ہوتے ہیں۔ مصنف نے ان کی اس بے حسی کی وجہ سے ہی انھیں بے غیرت قرار دیا ہے ان دونوں میں نہ تو عزت نفس باقی ہے اور نہ ہی رشتے کو سمجھنے اور نبھانے کا جذبہ پیٹ کی آگ کو بجھانے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں جس کی وضاحت اس اقتباس سے ہوجاتی ہے۔

''جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹے دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی جوان بیوی بدھیا دردِزہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی، فضا سناٹے میں غرق سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔ گھیسو نے کہا معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا دیکھ تو آ۔ مادھو دردناک لہجے میں بولا۔ مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤوں؟ تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ زندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ بے وفائی۔''(۲)

اس اقتباس سے دونوں کی ذہنیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے یہ دونوں نہ صرف اپنے کنبہ بلکہ گاؤں والوں کے بھی مجرم ہیں۔ایک طرف باپ بیٹے دونوں گھر کی بہو کو مرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اس طرح وہ غیر انسانی سلوک کے لیے مجرم ہیں وہیں دوسری طرف وہ گاؤں والوں کے مجرم اس لیے ہیں کہ بدھیا کی موت کے کفن کے لیے اکٹھا کیے گے پیسے کا غلط استعمال کرتے ہیں بدھیا کی موت پر یہ دونوں رونے کا ڈرامہ کرتے ہیں اور گاؤں سے بدھیا کی کفن کے لیے چندہ اکٹھا تو کرتے ہیں لیکن کفن نہیں خریدتے ہیں۔کفن کے لیے پانچ روپیہ ان کے ہاتھ میں جیسے ہی آتا ہے ان کی ذہنی کیفیت بدلنے لگتی ہے اور سستا اور مہنگا کفن پر تبادلہ خیال شروع کر دیتے ہیں اور پھر کفن کی ضرورت پر ہی سوال اٹھانے لگتے ہیں۔

''بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا۔لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے، کیوں مادھو''
مادھو بولا'' ہاں لکڑی تو بہت ہے اب کپھن چاہیے!
''تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں۔
''ہاں اور کیا لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی رات کو کپھن کون دیکھتا ہے۔
'' کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھاکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اس کے مرنے پر نیا کپھن چاہیے۔
''کپھن لاس کے ساتھ جل تو جاتا ہے''۔(۳)

اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے نزدیک پیسے کی اہمیت زیادہ ہے۔گھیسو اور مادھو جیسے کردار معاشرے کو سمجھنے کا موقع دیتے ہیں پریم چند نے جس سماج کو دیکھا تھا اور آج ہم جس سماج میں رہ رہے ہیں اس میں کتنا فرق ہے اس کی خوبصورت تصویر اس افسانے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اس افسانے میں ہمارے سماجی اور مذہبی نظام پر بھی طنز کیا گیا ہے جس میں انسان کی قدر اس کے جیتے جی تو نہیں کی جاتی لیکن اس کے مرنے کے بعد مختلف رسوم ورواج پر لاکھوں روپے خرچ کر دیے جاتے ہیں۔یہاں مصنف نے زندگی اور موت سے متعلق مختلف رویوں کے علاوہ زندہ افراد سے نفرت اور مردہ پرستی میں برابر کے شریک ہونے والے سماج کے نام نہاد باعزت لوگوں کے کردار کو اجاگر کیا ہے۔یہاں نہ صرف مادھو بلکہ یہ افسانہ خود ایک سوال قائم کرتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں زندگی کی اہمیت موت سے کم کیوں ہے۔ہمارے رسم ورواج اور اصول

زندگی پر موت کو کیوں ترجیح دیتے ہیں۔اس افسانے میں گھیسو اور مادھو بدھیا کی موت کے بعد ہی اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کی تکمیل کر سکے ہیں۔اچھا اور پیٹ بھر کے کھانا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے جس کی تکمیل بدھیا کی موت کے بعد ہوتی ہے۔

''بڑی اچھی تھی بیچاری۔مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔گوشت اور سالن اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں شراب خانے کے سامنے ہی دکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے تھے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے پوریاں کھا رہے تھے۔ جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر''۔(۴)

گھیسو اور مادھو شراب خانے میں آنے کے بعد موت کا مرثیہ نہیں پڑھتے بلکہ زندگی کی نئی ساز چھیڑتے ہیں جس میں زندگی کی وہ خواہشات ہوتی ہیں جن کو آج پورا کرنے کا موقع ملا ہے۔یہاں بدھیا ان دونوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ انھیں زندگی میں پہلی بار جو شراب اور لذیذ کھانا میسر ہوتا ہے وہ بدھیا کی موت کے بدولت ہی ہو پاتا ہے۔

سوامی وویکانند نے کہا تھا جنت کا راستہ جہنم سے ہو کر جاتا ہے۔گھیسو اور مادھو ایسے ہی جہنمی راستے پر چل کر اپنی زندگی کے سب سے اہم اور دیرینہ خواہش کو پوری کرتے ہیں۔اناج کی کمی اور کھانے کی قلت نے ان دونوں کو بے حس بنا دیا تھا عمر میں بڑا ہونے کے باعث گھیسو نے اس آگ کو زیادہ محسوس کیا تھا اور اسی وجہ سے وہ زیادہ ڈھیٹ اور بے شرم ہو گیا تھا۔ پریم چند نے اس افسانے میں بھوک کو انسان کی بنیادی ضرورت کے طور پر پیش کیا ہے جس کے لیے وہ دو واقعات بیان کرتے ہیں اول تو ٹھاکر کی بارات میں دعوت کا واقعہ دوم کفن کے پیسے سے گوشت مچھلی کھانا اور شراب پینا۔ٹھاکر کی بارات میں جو کھانا کھیسو کو ملتا ہے اس کا بیان گھیسو ان لفظوں میں کرتا ہے:

''گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی بارات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور

آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا وہ بھوج نہیں بھولتا۔تب سے پھر اس طرح کا کھانا بھر پیٹ نہیں ملا۔لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائیں تھیں۔سب کو چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی۔چٹنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ،اے رسے دار ترکاری دہی چٹنی مٹھائی۔اب کیا بتاؤں کے اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہے مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔لوگوں نے تو ایسا کھایا ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں۔منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے، پتّل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں مگر وہ ہیں کہ دیے جاتے ہیں اور جب سب نے منہ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی۔کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر،مادھو ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا اب کہاں کوئی ایسے بھوج کھلاتا ہے۔

اب کوئی کیا کھلائے گا۔وہ جمانا دسرا تھا۔اب تو سب کو کفایت سوجھی ہے۔

تم نے بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی؟

بیس سے زیادہ کھائی تھیں نہ۔

میں پچاس کھا جاتا۔‘‘(۵)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوجاتا کہ گھیسو کو گذشتہ بیس برسوں میں اس بارات کے علاوہ کبھی اچھا کھانا نہیں ملا۔ وہیں دوسری طرف مادھو کا یہ کہنا کہ میں پچاس کھا جاتا، اس کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے۔یہی وہ بنیادی چیز ہے جس کے باعث وہ کفن کے پیسے سے کفن نہ خرید کر شراب اور لذیذ کھانا خریدتا ہے۔کہانی کی پیش کش بہت جذباتی ہے۔ویسے بھی فکشن میں جذباتیت کی کمی سے اس کا پلاٹ کمزور ہوجاتا ہے پیشکش کا انداز ایسا ہونا چاہیے کہ وہ قاری کو جذباتی بنادے اور کہانی کے اختتام تک وہ اس سے جڑا رہے۔ اس افسانے کا کمال یہ ہے کہ جس کفن کی بات شروع سے اخیر تک ہوتی ہے نہ تو وہ کفن خریدا جاتا ہے اور نہ ہی استعمال ہوتا ہے اور نہ ہی بدھیا کی آخری رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ایک طرف جہاں بدھیا کا مردہ جسم بغیر کفن کے پڑا رہتا ہے۔ وہیں دوسری طرف وہ دونوں شراب خانے میں مدہوش ہوکر کبیر کا دوہا۔۔۔ٹھگنی

کیوں نیناں جھمکاوے، ٹھگنی' گاتے ہوئے شراب خانے میں ہی گر جاتے ہیں۔

پریم چند نے اس افسانے میں بنیادی طور سے غریبی اور فاقہ کشی کے علاوہ انسان کی بے حسی اور کاہلی پر خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے۔ اس افسانے میں یہ دونوں باپ بیٹے تب تک کوئی کام نہیں کرتے جب تک فاقہ کی نوبت نہ آجائے۔ اس افسانے کا مرکزی خیال انسان کی بے ضمیری اور بے حسی ہے اس کے ساتھ ہی اس میں زمینداروں اور اعلی طبقہ کے خلاف ایک ردعمل بھی ہے۔ گھیسو کو یہ احساس ہے کہ سماج میں رات دن محنت کرنے کے بعد بھی مزدوروں کو دو وقت کی روٹی آسانی سے میسر نہیں ہو پاتی ہے تو پھر ہم اتنا ہی کام کریں گے جس سے ہمارا گزر بسر ہو سکے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی محنت کا فائدہ کسی اور کو ملے اسی وجہ سے وہ کسی کی مزدوری کرنے کی جگہ لکڑی توڑ کر بازار میں بیچنا زیادہ بہتر سمجھا ہے۔

"اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی یہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔"

گھیسو کے اسی رویے کی وجیہ سے گاؤں کے لوگ اس کو پسند نہیں کرتے۔ گھیسو کے رویے میں یہ بدلاؤ زمینداروں کے مظالم اور استحصالی رویے کی وجہ سے ہوا کیونکہ وہ مزدوروں کو ان کی جائز مزدوری دینے کی جگہ ان کا استحصال کرتے ہیں۔

پریم چند نے بنیادی طور پر بھوک اور افلاس کو اس افسانے کا موضوع بنایا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان دنیا کے مسائل سے تنگ آ کر ہی غلط کام کی طرف راغب ہوتا ہے اور ان مسائل کے سامنے اس کے نزدیک سماج و معاشرے کے تمام اصول وضوابط بے معنی ہو جاتے ہیں۔

بھوک انسان کی بنیادی ضرورت ہے جو بعض اوقات اس کو جانور تک بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں جو سب سے زیادہ اہم چیز ہے وہ انسان کے پیٹ کی بھوک ہے جس کی تکمیل کے لیے انسان تمام اخلاقی اقدار سے منہ موڑ کر غیر انسانی سلوک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ منشی پریم چند نے اپنی کہانی بڑے گھر کی بیٹی میں اعتراف کیا ہے کہ بھوک سے پریشان انسان ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتا ہے۔

پریم چند کا تعلق جس عہد سے تھا اس میں برطانوی حکومت کے ظلم و جبر اور بدانتظامی کے باعث

جہاں ملک تباہ ہو رہا تھا وہیں قحط سالی، متلف وبائی بیماریوں سے لوگوں کی زندگی متاثر ہو رہی تھی۔ دوسری طرف جاگیردار، ساہوکار، کسان اور سرمایہ داروں کا آپس میں تصادم چل رہا تھا۔ ان حالات میں عام آدمی کا اس سے متاثر ہونا ایک فطری امر تھا۔ دو وقت کی روٹی کے لیے عام آدمی کو طرح طرح کی پریشانیاں اٹھانی پڑتی تھیں۔ استحصال اور ظلم وستم نے انسان کو حاشیے پر ڈال دیا تھا۔ اس ظلم اور استحصال کو پریم چند نے اس افسانے میں پیش کیا ہے۔ یہاں دیکھا جائے تو گھیسو اور مادھو پیدائشی کاہل اور بے حس نہیں ہیں بلکہ معاشرے نے انھیں ایسا بننے پر مجبور کیا ہے۔ ہمارا معاشرہ، اس کے فرسودہ رسم ورواج، معاشی تفریق، طبقاتی کشمکش کے ساتھ ہی مہاجنی نظام کے باعث ہونے والے استحصال نے ہی سماج میں گھیسو اور مادھو جیسے کرداروں کو پیدا کیا ہے۔ سماجی استحصال کے باعث ہی ان کے یہاں اخلاقی گراوٹ آئی ہے۔ ان کے لیے تمام رشتے ناطے اور اصول وضوابط ان کے پیٹ کی بھوک کے سامنے چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔ جس کے لیے وہ بذاتِ خود کم اور ان کا معاشرہ زیادہ ذمہ دار ہے۔ اسی بات کو اس افسانے میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اس افسانیکی اہمیت پریم چند کے عہد میں جتنی تھی آج بھی اتنی ہی ہے اور یہی اس افسانے کی کامیابی کی دلیل ہے۔

☆☆☆

حواشی:

(۱)۔ اردو فکشن کے مضمرات۔ ابوالکلام قاسمی، صفحہ 241

(۲)۔ پریم چند کے شاہکار افسانے مرتب۔ اعجاز قادر، صفحہ 135

(۳)۔ پریم چند کے شاہکار افسانے۔ اعجاز قادر، صفحہ 141

(۴)۔ پریم چند کے شاہکار افسانے۔ اعجاز قادر، صفحہ 142

(۵)۔ پریم چند کے شاہکار افسانے، اعجاز قادر، صفحہ 138,139

(۶)۔ پریم چند کے شاہکار افسانے۔ اعجاز قادر، صفحہ 140